علمی و تحقیقی مجلہ "محاکمہ" یونیورسٹی آف سیالکوٹ

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

ڈاکٹر محمد رؤف، پوسٹ ڈاک اسکالر، آئی آر آئی، اسلامک انٹرنیشنل یونی ورسٹی، اسلام آباد

ڈاکٹر عدنان احمد، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، یونی ورسٹی آف جھنگ، جھنگ

ہماری قومی یک جہتی کی لسانی حرکیات اور نو استعماری سیاق

Linguistic Dynamics of Our National Consensus and Neo-colonial Context

Dr. Muhammad Rauf, Post Doc. Scholar, IRI, IIU, Islamabad, muhammadrauf992@ gmail.com

Dr. Adnan Ahmad, Assistant Professor, Deptt. Of Urdu, University of Jhang, Jhang

Abstract

In the running neo-colonial era Urdu language has become much more mandatory for our national identity then that of creating like-mindedness among the people of the state. The principles and requisites of maintaining the distinguishing characteristics of a particular nation, in a "global village" of ours have changed a lot because the creation of similarity in ideas, feelings, temperaments and actions in neo-colonized nations is one of the fundamental characteristics of prevailing globalization. In such a crucial "do or die" position the national languages prove to be the battle ground between the neo-masters and the neo-slaves. In this article, the essentiality of our national Urdu language in the management of national consensus as well as the maintaining of national identity has been discussed in the context of today's neo-colonized era.

Keywords: Urdu, National language, Neo-colonialism, National Identity, National consensus, Globalization, Language Shift, language Attitude, Code Switching.

ہماری دانش گاہوں میں 'قومی یک جہتی کے لیے اردو کی ناگزیریت' کا متفق علیہ موضوع اگر اکیسویں صدی ربعِ اوّل کے اختتامی مراحل پہ بھی زیرِ بحث ہے تو کوئی سادہ ہی اس کو سادہ کہے۔ ایک عرصہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے موقر مقالے "اردو، قومی یکجہتی اور پاکستان" میں اس زبان کی اجتماعیت ساز حیثیت واضح کرتے ہوئے اس کے نفاذ میں اڑچن ڈالنے والے جن "چند مگر نہایت طاقتور عناصر" کی طرف نقاب پوش سا اشارہ کیا تھا اور دلیل کے طور پر ان عناصر کی پیش کردہ بعض کاذب حقیقتوں کا کچا چٹھہ بھی کھولا،[1] ان چند عناصر کی حیلہ جوئیاں فی زمانہ اور بھی شدت سے عملیتی سچائیوں (Pragmatic Realities) میں ڈھلی جاتی ہیں۔ لہٰذا تحصیلِ حاصل کے اس مبحث کہن میں 'مضمونِ تازہ' کی اگر کچھ فیہ نکلتی ہے تو محض یہ کہ مذکورہ زبان کو معاشی سرگرمیوں سے جوڑنے اور سماجی اعتباریت کا مشار بنانے میں حائل

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

شخصیتوں، اداروں اور ان کے پسِ پردہ عالمی حرکیات کی نقاب کشائی کی جائے۔ یہاں سوال مگر یہ ہے کہ آیا ہماری دانش گاہوں میں ایسی آزادانہ فضا موجود ہے کہ جس میں قومی زبان کو اوقاف کے مال میں تبدیل کرتے ایسے 'چند عناصر' پر تحقیق کی سپاٹ زبان میں بات ہو سکے، اور بالفرضِ محال آزادانہ فضا اگر کچھ ہے بھی تو کیا ایسے بہجتی حاصلات کو نافذ کرنے کے لیے 'امکان کا ممکن' سوچا جا سکتا ہے؟ جب علم ہی دولت اور طاقت سے ساجھے داری کی تثلیث بنائے پیراڈائم شفٹنگ میں معاونت کرنے لگے تو ایسے میں حکمت و بصیرت کی عمل داری معلوم!

مذکورہ بالا موضوع لاہور گیریژن یونی ورسٹی کے ۳۰ اور ۳۱/ اکتوبر ۲۰۲۳ء کو منعقدہ دو روزہ بین الاقوامی سیمینار کا سرِ عنوان تھا۔ واضح رہے کہ اس لسانی بصیرت کا استنباط بابائے قوم کے جس مخلصانہ ویژن سے کیا جاتا ہے ان کے فوراً بعد کی متبدل سیاسی فضا میں اس کے اطلاقی عواقب و نتائج بہر حال بازدید کے لیے محلِ نظر رہے ہیں۔ لمحۂ موجود تک صوتِ حال یہ ہے کہ نظریۂ پاکستان کی فوری محرک، تحریکِ آزادی کی مدد و معاون اور مملکتِ خداداد میں اپنے قومی اعتبار کی حق دار اردو زبان کے ساتھ فانی بدایونی کے مہمان کا سا معاملہ ٹھہرا ہے:

مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی
وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا(۲)

غربت راس نہیں آ رہی اور وطن آنسوؤں کی طرح چھوٹ رہا کہ واپسی کی بھی کوئی اُمید نہیں۔ ستم ظریفی یہ رہی کہ عالم گیریت کی پیدا کردہ نئی لسانی جدلیت نے نہ صرف مذکورہ مسلّمے کے امکانات، خدشات اور توقعات پر نئے سوالات اٹھا دیے ہیں بلکہ اس کی حکمتِ کار بھی پیچیدہ تر ہوئی جاتی ہے۔ آج ہمارے درمیان ایک طرف تو قائدِ اعظم جیسی ہر دلعزیز قیادت موجود نہیں اور اس پر طرّہ یہ کہ ملک کے طول و عرض میں اس پانچویں کالم کی انتشاری سرگرمیاں بھی خوب بڑھی جاتی ہیں جنھیں قائد محترم نے اس نوع کی تفرقہ انگیز محاذ آرائی کا اصل محرک قرار دیا تھا۔ ایسے میں قومی یک جہتی کے لیے اردو کی ناگزیریت کا 'منہ زبانی' ورد کیے جانے کے بجائے اگر عصری مقتضیات کے پیشِ نظر عملی طور پر قومی حسّاسیت بیدار کرتے ہوئے بعض ضروری اقدامات کر لیے جائیں، یعنی نردبان کے ایک زینے کو پھلاندنے کی ضد ترک کر کے زینہ بہ زینہ لبِ بام تک پہنچنے کی سعی کی جائے تو شاید منزل آسان ہو رہے۔ دیکھیے تو صحیح کہ گذشتہ پون صدی کے دورانیے میں ہمارے

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

ہاں اس کم نصیب زبان کی نفاذی کاوشیں کرنے والے انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ کے کتنے ہی مردِ کار تاریخ کا حصہ بن رہے مگر اس کی راہ میں حائل 'آسیبی مخلوقات' نے کسی ایک کی چلنے نہ دی۔ یوں مذکورہ صدر دعوے کے استدلال میں ہر دو طرح سے ایک دائرویت(circulation) سی در آتی ہے۔ اردو اس لیے ناگزیر ہے کہ قومی یک جہتی ممکن ہو سکے اور قومی یک جہتی اس لیے لازم ہے کہ مذکورہ زبان کو اتفقِ رائے سے ہماری ریاست کے لسانی سنگھاسن پر بٹھانا ممکن ہو پائے۔ اب باہم لازم و ملزوم دو امور میں ترجیحی اوّلیت کسے دی جائے؟ کہنے کو تو 'مطلع' میں آ پڑنے والی یہ سخن گسترانہ بات فلسفیانہ روایت میں موجود انڈا اور مرغی کی اوّلیاتی جدلیات کا شاخسانہ لگتی ہے مگر ذرا توقف کیجیے تو اس کی معقولیت کے نشانات پاکستان کے تصور اور تشکیل و ارتقا کی منزل بہ منزل داستان میں بکھرے ملیں گے۔ اس کے لیے وہ درجن بھر کمیشن رپورٹیں، تعلیمی پالیسیاں، آئینی شقیں اور لسانی تجاویز ملاحظہ کی جا سکتی ہیں جو مملکتِ خداداد کی آزادی کے فقط تین ماہ بعد سے لے کر اسے 'ریاستِ مدینہ' کے مثالی ماڈل پر استوار کرنے کے حالیہ وعدہ و عید تک گاہے بہ گاہے پیش کی جاتی رہی۔ اس دوران میں ایک طرف اگر ضیاؔ الحق کا دورِ حکومت تعلیم و تعلم کو اسلامائز کرنے کی دھن میں اردو کو مسلم تشخص کی علامت سمجھ کر اسے عملی طور پر قومیانے اور استعماری دور سے اس کی حریف چلی آ رہی انگریزی زبان کو نو آبادیاتی ورثہ قرار دیتے ہوئے حاشیے پر دھکیلنے کی کوشش کرتا رہا تو دوسری طرف صدر مشرف کے 'روشن خیال اور اعتدال پسندی' کے پروجیکٹ میں متناقض طور پر پھر سے اردو کے بجائے انگریزی ہی کو ریاست کے لسانی سنگھاسن پر براجمان کرنے کا عزم بالجزم اپنی نیرنگیاں دکھاتا آیا ہے۔[۳]

اوّل الذکر بیانیے کی فکری بنیاد اگر اردو کو اسلامی تشخص کی علامت قرار دیتے ہوئے اس کی علمیاتی ساخت میں گندھی روشن خیالی اور صوفیانہ رند مشربی سے صرفِ نظر کا نتیجہ تھی اور انگریزی کی بابت نو آبادیاتی باشندوں کی سی تعصباتی حسّیت کی غماز بھی تو موخر الذکر مفکرین کا کہنا یہ تھا کہ 'دانشِ مغربیاں' کی پروردہ یہی انگریزی زبان دراصل جدید زمینی حقائق کے تناظر میں بین الاقوامی بساط پر اپنی چال بچائے رکھنے کے لیے ناگزیر ہو چکی تھی نیز یہ کشف بھی ہوا کہ داخلی سطح پر اسی زبان میں تعلیم و تعلم سے موجودہ طبقاتی تفاوت کے خاتمے کی امیدیں باندھنی چاہییں۔ یاللعجب ! لیکن کب کھلا ہم پر یہ راز؛ نائن الیون کے بعد، کہ جب نو استعماریت کے ثقافتی جنگجو (Cultural Warrier) نے ہمیں سیکولر روشن خیالی اور

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

اعتدال پسندی کی پالیسی دے کر عسکری اسلام کے بجائے سِول اسلام اور اس کا پیدا کردہ 'سافٹ امیج' "مہذب دنیا" کو دکھانے کا نیا سکرپٹ تھما دیا۔ یادش بخیر سید مبارک شاہ کے کلام میں نو استعماری بصیرت افروزی کے سامان ملتے ہیں:

وہ پنجرہ توڑ کر شدت بڑھا دے گا اسیری کی
ہوا کو قید کر لے گا مجھے آزاد رکھے گا(۴)

ایسی متبائن منصوبہ بندیوں کی تجزیہ کاری سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں لسانی مسئلے کو ترجیحی بنیادوں پر زیرِ غور لانے میں یا تو غیر سنجیدگی کا برتاؤ رہا یا پھر امکانی سنجیدگی کے پسِ آئینہ کوئی اور تھا کہ جس کی انگشتِ ساحرانہ کا پیدا کردہ ارتعاش ہماری فکری حرکیات میں ایسا در آیا کہ نتیجتاً: 'تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا'

وطنِ عزیز کے نو آبادیاتی اور ما قبل نو آبادیاتی ماضی میں لسانی سیاست کی حرکیات بہت اہم وقوعات و نتائج پر منتج ہوتی رہی ہیں۔ بابائے قوم کے ایک فرمان کے مطابق ۔۔۔ نصابی کتابوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے جس کا استناد متنازعہ بھی ہے ۔۔۔ "پاکستان تو اسی روز وجود میں آ گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا۔"(۵) یہیں سے دو قومی نظریے کے وہ نشانات ملنا شروع ہوتے ہیں جن کی بنیاد جداگانہ ثقافتی تشخص پر تھی اور یہ کہنے کی تو ضرورت نہیں کہ لسانی عنصر ایسی ممتاز تشخص سازی میں کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔

القصہ مرورِ ایّام کے ساتھ ساتھ کچھ عربی، فارسی اور ترکی حکمرانوں کے ادوار میں مقامی اور نووارد زبانوں کے اختلاط و ادغام سے یہاں کی لسانی شناختوں میں مسابقتی نشو و ارتقا شروع ہوا جس کے نتیجے میں بالآخر ایک مقامی بولی نے اردو زبان کا روپ دھار لیا۔

ایسے میں یورپی سرزمین کی 'شائستہ' اقوام کے ورود کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جنھوں نے یہاں کی کم نگاہ مرکزی حکومت اور باہم دست و گریباں باغی ریاستوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پوری سیاسی بساط پر ہی قبضہ جمانے کی چالیں چلنا شروع کر دیں۔ ان میں سب سے اہم اور کیمو فلاج چال فورٹ ولیم کالج میں مقامی زبانوں کے فروغ کی غرض سے قائم کیے گئے اردو اور ہندی زبان کے وہ الگ الگ شعبے تھے جن کی باہم تقابلی نوعیت کی کارگزاریوں سے مذکورہ دونوں زبانوں کی مشترکہ ثقافتی جہات دبتی اور مذہبی شناختیں بدستور نمایاں ہوتی چلی گئیں جس سے لازمی نتیجے کے طور پر اردو

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

ہندی تنازعے کی راہ ہموار ہوئی۔ دوسری طرف انھی لسانی مجادلات سے استعماری حیلہ سازوں نے 'کلچرل پالیٹکس' کا سامان کرتے ہوئے یہاں کے مختلف بلکہ بعض پہلوؤں سے متخالف ثقافتی عناصر کو یورپی معیارات پر جانچ پرکھ کر انھیں دقیانوسی، غیر معقول اور از حد وقتیایا ہوا (Out Dated) ثابت کر کے 'سپید آدمی' کو اس 'غیر شائستہ قوم' کی تہذیب و تربیت کے مقدس مشن پر لگا دیا۔ اسی دوران ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے کے زرخیز ذہن سے پھوٹتی تعلیمی اصطلاحات کی سیادت میں مقامی آبادی کو یہ بات خوب متبادر کروائی گئی کہ انگریزی زبان مقتدر طبقات سے انسلاک کی بنا پر اعلیٰ لسانی خواص، علمی فوقیت اور سماجی علویت کی حامل ہے جسے سیکھے بغیر کوئی فرد بشر مہذب، تعلیم یافتہ اور سیاسی و سماجی طور پر باشعور ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ دراصل یہ لسانی بیانیہ مقامی زبانوں پر انگریزی زبان کے استعماری غلبے کو منطقی بنیادیں فراہم کرنے کی ایک کاوش تھی، ایسی ساحرانہ کاوش کہ جس سے متاثر ہو کر کبھی سر سید جیسے مصلحِ قوم بھی یہ سوچنے لگے تھے:

"اگر ہم اپنی اصلی ترقی چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی مادری زبان تک کو بھول جائیں ---۔ ہماری زبان یورپ کی اعلیٰ زبانوں میں سے انگلش یا فرنچ ہو جائے۔"(۶)

دوسری طرف اردو کا معاملہ یہ تھا کہ یہ خودرو زبان مقامی اقوام کی بے ساختہ یک جہتی کے نتیجے میں ناگزیر طور پر مشترکہ ذریعۂ اظہار بنی تھی نہ کہ اس کی برعکس صورت میں۔ یہاں ہندوستانی قومیت کی یکجہتی میں اردو زبان کو ناگزیر محرک کا درجہ دینے والوں کی منطق محلِ نظر ٹھہرتی ہے۔ سر سید احمد خان کو، جو متحدہ ہندوستانی قومیت پر پورے خلوص سے یقین رکھتے اور یوں لاشعوری طور پر ہی سہی، اسلام کے جداگانہ نظریۂ قومیت سے صرفِ نظر کیے جاتے تھے، اسی لسانی تنازعے سے شرحِ صدر میسر آئی اور انھیں آخر الامر ہندو نیشنل ازم سے دل تنگ ہو کر دو قومی نظریے کا دم بھرنا پڑا حالانکہ ان کی زندگی کے بعد بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں انھی دونوں اقوام میں لسانی دوئی کے باوجود یکجہتی کے کئی مظاہرے بھی دیکھنے کو ملے جو یقیناً بعض دیگر سیاسی و سماجی محرکات کا ثمرہ تھے۔

دراصل کسی زبان کی مشترکہ حیثیت متعلقہ قوم کے مختلف ذیلی گروہوں کے درمیان پائے جانے والے اغراض و مقاصد کی یکجہتی کا ثمرہ ہوا کرتی ہے جیسا کہ ماقبل نو آبادیاتی دور میں اردو کا معاملہ رہا۔ اسے دیگر مقامی زبانوں سے بوجہ منتخب کر کے تحریکِ آزادیٔ ہند کے لیے استعمال کیا گیا تھا جس پر لسانی حوالے سے یہاں کی متبائن (جدا جدا) مذہبی شناختوں کو کبھی

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

کسی کلیدی نوعیت کے اعتراض کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کیوں کہ ایسے میں یہ سبھی قومی شناختیں استعماری مکڑ جال سے نجات پانے جیسے مشترکہ ہدف پر کاربند ہو چکی تھیں اور اس مقصدیتی یکجہتی نے واقعات اور حقائق کی روشنی میں انھیں اردو نامی ایک نوزائیدہ اور بڑی حد تک سیکولر شناخت والے لسانی ذریعۂ ابلاغ کے بلا تعصب برتاؤ کی ناگزیریت پر کاربند کر دیا تھا۔ لہٰذا معلوم یہ ہوا کہ ۱۸۶۷ء کا اردو ہندی تنازعہ فی الاصل استعمار بافی کی ایک ضمنی کارروائی تھی جسے پھوٹ ڈالو اور راج کرو (Divide and Rule) کے اصول کی عملی صورت کہنا چاہیے۔ واضح رہے کہ استعماری تناظر میں 'مقاصدِ مفیدہ' کی محافظت کرتے ہوئے مذکورہ صورت کے برعکس رنگ، نسل، زبان یا جغرافیائی خطے میں اشتراک و انسلاک کی بنا پر باہمی رواداری اور مشترکہ اقدار و روایات کی تعبیر و تشریح میں بھی منشی ذکا اللہ جیسے مورخین اور اجتماعی فکر و نظر سے بے نیاز ادیبوں نے جداگانہ مسلم قومیت کے ابطال کی دلالتیں ڈھونڈ نکالیں۔ ذرا غور کیا جائے تو مذکورہ ہر دو متناقض بیانیوں (ہندوستانی ایک قوم ہیں اور ہندوستان میں مختلف اقوام بستی ہیں) کا ماحصل مستعمرہ اقوام کو استعماری اقلیم کے حلقۂ اثر میں مقید رکھنے کے واضح امکانات رکھتا ہے؛ ایک کا داعیہ مسلمانوں کی آفاق گیر مرکزیت کو چیلنج کرنا تو دوسرے کا مدعا مقامی عوام میں مشترکہ تحریکِ آزادی کے امکانات ختم کرنا۔ جدید تصورِ قومیت پر یقین رکھنے والے سیکولر ذہنیت کے اکابرین کی فکری کجی کو طشت از بام کرتے ہوئے فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

> "ہندو مسلم یگانگت کا یہ تصور سامراج نواز مورخوں کی ذہنی اختراع ہے اور ہمیشہ اسے جداگانہ مسلم قومیت کے تصور کو جھٹلانے کی خاطر ہوا دی جاتی ہے"(۷)

پاکستان بنا تو اس کی رعیت کثیر لسانی ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف جغرافیائی اکائیوں میں بھی یوں منقسم تھی اور یوں انھیں جدا جدا لسانی شناختیں بھی کہا جا سکتا تھا۔ اب قومی زبان کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو بادی النظر میں دو آپشن سامنے تھے: اپنے سابقہ نوآبادیاتی آقاؤں کی زبان کا تسلسل بحال رکھا جائے یعنی انگریزی کو اپنا لیا جائے یا اکثریتی آبادی (۵۶٪) کی زبان یعنی بنگلہ زبان قومی قرار پائے۔ پہلا راستہ غلامانہ ذہنیت کے تسلسل کا تھا تو دوسرا زبان کی بین الصوبائی نارسائیوں سے تغافل کا۔ بنگلہ اکثریت کی زبان تو تھی لیکن مغربی پاکستان میں اس کا عمل دخل بہت محدود تھا جبکہ اس کے بالمقابل پاکستان کی کسی بھی دوسری زبان کے مقابلے میں اردو پورے ملک میں اچھی خاصی ترویج اور پزیرائی رکھتی تھی۔ لہٰذا بابائے قوم قائداعظم نے

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

مذکورہ دونوں راستوں کے بجائے موثر معقولات کی روشنی میں ایک تیسرا راستہ منتخب کیا جس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "There can be only one state language if the component parts of this state are to march forward in unison and that language, in my opinion, can only be Urdu"(8)

ہمارے بعض لسانی تجزیہ کاروں کی طرح سٹینلے والپرٹ۔۔۔مصنف "Jinnah of Pakistan"۔۔۔نے بھی پیکرِ خلوص قائدِ محترم کی اس رائے کو "Worst Political Blunder" قرار دیا تھا۔(9) دراصل رائے کا تعلق منطق سے ہوتا ہے اور اخلاص کی نسبت کردار سے۔ سرسید کے اخلاصِ عمل کا منکر شاید ہی کوئی ڈھونڈے سے ملے، جدید علم الکلام میں آپ سے مگر ایسے ایسے تسامحات ہوئے کہ مولانا مودودی جیسی متین فکری شخصیت سے بھی "مخلص گمراہ" جیسے القابات سے نوازے گئے۔ راست بازی کے اسی کڑے معیار پر مذکورہ بالا لسانی بصیرت کو پرکھا جائے تو بھی اس کی صوابت سے انکار ممکن نہیں رہتا، اڑچن مگر اس کی نفاذی حکیِ عملی میں آن پڑتی ہے کہ جس کے مخفی تعامل (Catalytic interaction) کی بنا پر یہ زبان نہ تو آج تک سرکاری سطح پر کماحقہ رائج ہو سکی نہ شاید مستقبل میں کبھی ایسا ہو پائے گا۔ دل کو خوش رکھنے کے خیالات کی بات اپنی جگہ۔ ایسی نزاعی بات کی فوری تردید سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ آج نواستعماریت کی یک لسانی دھونس نے منطقی بنیادوں پر مستعمرہ اقوام کے لسانی رویوں کو اتھل پتھل کرنا شروع کر رکھا ہے۔ انگریزی اب عالمی رابطے کی ہی زبان نہیں بلکہ سائنس، ٹیکنالوجی اور دیگر سماجی علوم کی خزینہ دار ہوئے جانے پر عالمی اعتباریت International (Credibility) میں بھی اپنی مثال آپ ہے۔ یہاں تشویش ناک بات یہ ہے کہ مذکورہ لسانی اجارہ داری سینکڑوں زیر دستی زبانوں کو بھی اپنے اندر ضم کیے جاتی ہے۔ آج کل ہمارے ایف ایم ریڈیو کے تبصروں، ٹی وی کے تفریحی، تزئینی اور کھانے پینے کے پروگراموں یا سنوبری کے لیے ساز گار محفلوں میں اردو کے بجائے اُردش بولی جانے لگی ہے جس میں افعال اور جملے کی نحوی ساخت کے علاوہ قریب قریب سبھی الفاظ انگریزی کے ہوتے ہیں۔ ہماری درس گاہوں، علمی و ادبی محافل اور یہاں تک کہ گلی محلے کی لسانی فضا بھی ایک ہائی بریڈ طرزِ بیان کی غمازی کرنے لگی ہے جسے لمحۂ فکریہ جاننا چاہیے۔ اگرچہ ہندی

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

آمیز انگریزی کو بھی ہنگلش کہہ کر روا جانا جاتا ہے مگر اس میں ہمارے لیے خاطر جمعی کا سامان نہیں کہ اس معمولی تناسبِ ادغام سے مذکورہ مہمان زبان کی ثقافتی شناخت اور بالخصوص اس کی نحوی ساخت پر کچھ خاص اثر نہیں پڑتا جبکہ اردو میں یہ معاملت معکوسی ہوئی جاتی ہے۔ عام سماجی اجتماعات میں بھی اردو میں انگریزی کی کوڈ سوچنگ اس قدر بڑھ چکی ہے کہ روایتی نحوی ترتیب اور دو ایک دوسری پابندیوں کے سوا لینگوئج شفٹ کے واضح خدوخال متشکل ہونے لگے ہیں۔ اردو کی برقی خط کتابت سے لے کر تشہیراتی عبارتیں، ٹریفک کے اشارے، شادی بیاہ کے سندیسے اور جینے مرنے کے نامہ و پیام تک سبھی کچھ رومن حروف میں یلفظ کیا جانے لگا ہے۔ مزید برآں تعلیم و تربیت کے نام پر بننے والی این جی اوز جن کا ماٹو ہی "Changing Pakistan" ہے، دو قومی نظریے کی مزعومہ قومی یک جہتی کو عالمی یک رنگی کی راہ سدھا رہی ہیں جو دراصل یک قطبی دنیا کے مفادات سے ہم آہنگی کا شاخسانہ ہے۔

لسانی آلودگی (Linguistic Pollution) کا یہ تشویش ناک پیش منظر اپنے ابتدائی سرے پر قائداعظم کی وہ ابتدائی لسانی پالیسی لیے ہوئے ہے جس کے روبہ عمل آتے ہی متحدہ پاکستان کے دونوں بڑے لسانی گروہ باہم شدید تناؤ میں آ رہے۔ اس پالیسی کے مطابق سرکاری سطح پر اردو کو اپنانے کے علاوہ مقامی طور پر پنجابی یا بنگالی کو اپنے اپنے علاقے میں دفتری زبان بنایا جا سکتا تھا مگر مشرقی پاکستان کے عوام اس پر راضی نہ تھے۔ بنگالیوں کی نسبت پنجابی بولنے والے اردو زبان سے زیادہ لسانی اپنائیت محسوس کرتے تھے اور اکثر شہری علاقوں میں اسے ترجیحی بنیادوں پر بولا بھی جا رہا تھا۔ یوں بھی بنگالی زبان کی نسبت پنجابی کو ذریعۂ تعلیم و تعلم بنائے جانے کی کوئی محکم روایت موجود نہ تھی۔ پھر ایک اہم بات یہ کہ افواجِ پاکستان جیسے مقتدر ادارے میں اہلِ پنجاب کی کثرت تھی جو اپنی مادری زبان کی نسبت اردو کو ترجیحاً اپنانے میں زیادہ دلچسپی دکھا رہے تھے۔ ادھر ایوانِ صدر، وزیر اعظم ہاؤس اور تینوں افواج کے ہیڈ کوارٹرز جیسے مقتدر ادارے بھی مغربی پاکستان میں ہونے کے بموجب متحدہ قومیت کا آدرش تحفظات و خدشات کی نظر ہونے لگا اور مشرقی پاکستان میں احساسِ محرومی بڑھتا چلا گیا۔ بنگالی طلبہ نے بنگلہ زبان کو سرکاری سطح پر منظور کروانے کے لیے مظاہرے شروع کر دیے جنھیں دبانے کے لیے طاقت کا بے دریغ استعمال کیا گیا۔ آخر یہاں بڑھتی ہوئی لسانی حساسیت کے مدنظر ۱۹۵۶ء میں اردو کے ساتھ ساتھ بنگلہ کو بھی سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کر لیا گیا۔

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

قیامِ پاکستان کے ابتدائی ادوار میں ہی شروع ہونے والے اس لسانی مناقشے سے قومی یک جہتی میں وہ خلیج در آئی جسے مابعد کی چند معاشی اور سیاسی حرکیات نے مزید بڑھاوا دے کر اس نہج پر پہنچا دیا کہ افرادی اکثریت کو اقلیت سے علیحدگی اختیار کرنے کی انوکھی تگ و دو کرنا پڑی۔ یوں آدھا ملک ہاتھوں سے گنوا، پون صدی گزرے پر بھی ہم آج تک سرکاری سطح پر اردو کی اعتباری درجہ بندی کے خلطِ مبحث سے جونجھ رہے ہیں۔ کیا اتنے بڑے بڑے وقوعے یہ ایقان بخشنے کے لیے کافی نہیں کہ عصری تقاضوں کی پروردہ اضافیت کو نظر انداز کرتے اور بالخصوص قومی و رائج الوقتی قسم کے دوہرے معیار پر "منافقانہ"۔۔۔یادش بخیر! ڈاکٹر وحید قریشی سے ایک عیادتی ملاقات میں ضمناً یہ لفظ سننے میں آیا تھا۔۔۔پالیسیاں بناتے ہوئے ہم کبھی قومی یک جہتی کے سامان نہیں کر پائیں گے بلکہ بسا اوقات تو ایسی دھونس ہی بدھیا بٹھانے کا موجب بن جاتی ہے:

کچھ میرؔ کے حالات سے حاصل کرو عبرت
لے دے کے اب اِک عزتِ سادات رہی ہے(۱۰)

پاکستان کے موجودہ سیاسی و سماجی منظر نامے کے تناظر میں جب بالواسطہ قسم کی نو آبادیات کا 'عالم گیریت' فروغ مشن دنیا کی بڑی بڑی زبانوں کو حاشیے پر دھکیلتے ہوئے یک زبانی سماج (Linguistic Homogenization) پیدا کرنے میں بھرپور لسانی دھونس دکھا رہا ہے تو ایسے میں قومی زبان جیسے غیر متنازعہ مسئلے پر بنتا بگڑتا یہ خلطِ مبحث احساسِ زیاں کے غیر فعال ہونے کا اشاریہ سمجھنا چاہیے۔

یہ ایک تاریخی سچائی ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر میں زارِ روس نے وسط ایشیا پر قبضہ کر کے اسے روسی ترکمانستان کے نام سے اپنا مفتوح بنا لیا تو اس کی زبان سے زیادہ سروکار نہ رکھا تھا مگر بعد ازاں اشتراکی استعماریت نے اسے چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں بانٹ فارسی اور اردو والے رسم الخط کے بجائے لاطینی رسم الخط کی لَت پہ لگا دیا۔ پھر جب کمال اتاترک نے اسی رسم الخط کو سرکاری سرپرستی عطا کر دی تو لاشعوری طور پر ہی سہی، موصوف سے استعماری منصوبے کی موافقت میں وسط ایشیا اور ترکی کے لوگوں کو ان کے مخصوص ثقافتی تشخص سے غیر مربوط کرنے کا تسامح سرزد ہو رہا تھا۔ اس کے برعکس دوسری جنگِ عظیم کے بعد اہلِ جاپان امریکی عہدِ غلامی کا شکار بنے تو انھوں نے 'لِ زار کے سبھی اختیار' جانے

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

نہیں دیے بلکہ تعلیم و تربیت اور اپنی زبان کو بچا کر قومی تشخص پہ خوب پہرا دیا۔ آج ہمارے ہاں سوشل میڈیا پر رومن اردو کا ایک سیلاب اُمڈ آیا ہے اور جو کام ماضی میں اشتراکی استعماریت بھرپور استبدادی جبر سے روبہ عمل لاتی تھی، نو استعماریت کی پروردہ میڈیائی صورت حال میں اس کے لیے ہم خود کشاں کشاں چلے آتے ہیں۔ اس ضمن میں محمد اظہار الحق لکھتے ہیں:

"رومن اردو اسی مقام پر نئی پود کو لا کھڑا کرنا چاہتی ہے جہاں ترک کھڑے ہو کر نشانِ عبرت بنے ہوئے ہیں"(۱۱)

فی زمانہ انگریزی زبان کو 'گلوبل ولیج' کے کوچہ و بازار میں ایک عصری ضرورت بنائے تشویق و ترویج دے کر زبانوں کے عالمی تنوع کی راہیں مسدود کی جا رہی ہیں۔ پاکستان جیسے نو مستعمرہ ممالک میں اس زبان کو تعلیم و تعلم، سماجی مرتبے اور مقتدر ایوانوں تک رسائی کا پروانۂ راہداری بنا دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ آج انگریزی زبان کے آن لائن کاروباری مراکز مثلاً ایمازون، وال مارٹ، ایبے، سیم کلب وغیرہ سے نوجوان نسل کا بڑھتا ہوا معاشی ربط ضبط بھی ایسے لسانی انسلاک کا ناگزیر محرک بنا جاتا ہے جس کی تسلیمات نہ کرنا معقولیت کو اپنے ہاتھ سے دینے کے مترادف ہو گا۔ جدیدیت کا مہابیانیہ تحلیل ہونے پر اقوامِ عالم میں اپنے اپنے لسانی تشخص کی حساسیت ضرور ابھری مگر افادیت پسندی کی حرکیاتی شدت نے چینی، جاپانی اور جرمن اقوام کے شاہدانِ گلفام کو بھی باغ سے بازار میں آ کر زبانِ غیر میں شرحِ آرزو کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ عالم گیریت کی ہر سرگرمی کا کلیدی داعیہ چونکہ سرمایے کا حصول اور سرمایہ دارانہ نظام کی بقا ہوتا ہے لہٰذا علم کو بھی 'چیز' (Commodity) بنا کر اس زبان کی وساطت سے بیچنے کی راہ نکالی گئی ہے جس سے مذکورہ زبان ذریعۂ معاش کے روپ میں بنیادی ضرورت کی سطح پر اہمیت اختیار کرنے لگی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ناصر عباس نیّر لکھتے ہیں:

"عالمگیریت کی وجہ سے انگریزی کے نو آبادیاتی کردار میں ایک نئی جہت پیدا ہوئی ہے۔ اب یہ سیاسی و انتظامی اقتدار کے علاوہ معاشی اقتدار اور صارفیت کی زبان بھی ہے"(۱۲)

بلاشبہ انگریزی زبان کی بالادستی کا یہ نو ساختہ محرک خاصی مضبوط منطقی بنیادوں پر استوار ہوا ہے جس سے استفادہ کرنے کے لیے سرسید کی مذکورہ ریڈیکل حکمتِ عملی اور بھی موزوں ہوئی جاتی ہے مگر اس کی تشہیری سموک سکرین ہی میں وہ ہلاکت خیز نو استعماری کیپٹ لسٹ بھی پوشیدہ ہے جسے اسلامی دنیا کے نظمِ اجتماعی کے تناظر میں مہلک ترین عامل گردانا چاہیے۔ اس سے پہلے ہمیں یونانیوں، رومیوں اور عربوں کے سیاسی تسلط میں بھی ان مقتدر اقوام کی زبانوں یعنی یونانی، لاطینی

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

اور عربی کے مقامی زبانوں میں مقتدرانہ اثر و نفوذ کی مثالیں ملتی ہیں مگر بہت بدلے ہوئے تناظر کی اس نئی عالم گیریت کی لسانی حرکیات غلبہ آوری کے سادہ عمل سے زیادہ 'ماسوا سوزی' کا داعیہ رکھتی ہے۔ اس وقت ملّتِ اسلامیہ اپنی منفرد اساسِ وحدت کی بنا پر مقتدر عالمی قوتوں کے لیے سب سے بڑے نظری حریف کے امکانات رکھتی ہے لہٰذا نسلی، لسانی اور جغرافیائی تصورِ قومیت رکھنے والی اقوام سے کہیں بڑھ کر اسے ہی مذکورہ نوعیت کے مسائل میں الجھا کر مخدوش (Vulnerable) تر حالت میں رکھنے کی کاوشیں جاری ہیں۔ ہماری عربی، فارسی اور اردو جیسی زبانیں جن میں اسلامی تہذیب و تاریخ کی فکری روح یوں رچی بسی ہے کہ مانو: شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا ، یہ تمام کی تمام فی زمانہ ایسی لسانی دہشت گردی کی لپیٹ میں چلی آتی ہیں کہ جس سے "قومِ رسولِ ہاشمی" کو ترکیبِ خاص پر بنے رہنے میں غیر معمولی چیلنجز کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ ان حالات میں لسانی مقتضیات پر متوجہ ہونا دراصل جدید معنوں میں 'قومی تشخص' سے کہیں بڑھ کر مذہبی مدافعت کی ایک سرگرمی بن جاتا ہے۔ اِدھر احوالِ واقعی یہ ہے کہ انگریزی زبان کی عالمی پزیرائی اور اس سے جڑے سماجی تفاخر کے پیشِ نظر دیگر مستعمرہ ممالک کی طرح پاکستان جیسے اسلامی ممالک کی اشرافیہ بھی مذکورہ زبان کے سحر میں مبتلا رہتی ہے اور اسی عملیہ پسندانہ فلسفے کی طرفہ معاملت ہے کہ یہاں اردو زبان کو اقتدار کے بڑے مراکز؛ فوج، عدلیہ اور بیوروکریسی وغیرہ میں استحقاقی پزیرائی نہیں مل پاتی۔ بلاشبہ انگریزی زبان بین الاقوامی ذریعۂ اظہار اور اپنی مارکیٹ ویلیو کے لحاظ سے بہت اہمیت کی حامل ہے اور ایسے بدیسی معاملات و مشاغل میں دلچسپی رکھنے والوں کو اس میں خصوصی مہارت حاصل کرنی بھی چاہیے مگر اسے سرکاری زبان کے طور پر ذریعۂ تعلیم بنا کر پوری قوم کے اذہان پہ مسلط کیے رہنا کسی طور بجا نہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ پاکستان میں پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتو کے علاوہ دیگر کئی علاقائی زبانیں بولی جاتی ہیں لہٰذا قومی زبان کے سلسلے میں ایک ایسی مشترکہ حکمتِ عملی درکار ہے جس سے کسی فریق کو بھی اپنے لسانی استحصال کا شائبہ نہ رہے۔ آج کے مابعد جدید دور میں اگر عالم گیریت کی مرکز مائل قوتیں اقوامِ عالم کو یک زبانی سماج میں تبدیل کرنا چاہتی ہیں تو دوسری جانب ہر قوم اپنے شناختی تشخص کے مابہ الامتیاز کی بقا و احیا کو بھی زندگی اور موت کا مسئلہ بنائے ہوئے ہے۔ ایسے میں میانہ روی کی سبیل یہی ہے کہ عالم گیریت کے ارتقائیت پزیر عناصر کو مقامی اقدار و روایات میں ضم کر کے مدارِ حیات میں اپنی گردش بحال رکھی جائے۔ جدید لسانی حرکیات پر نظر رکھنے والے سماجی ماہرین اس نوع کے ضابطۂ عمل کو مقامیت اور

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

عالم گیریت کا ایسا امتزاج قرار دیتے ہیں جو عالمیائی مقامیت کاری (Global Indigenization) جیسے جدید ساختی سمجھوتے پر منتج ہو کر مابعد جدید معاشرے کو متناسب ثقافتی تنوع کے ساتھ اپنا توازن بنائے رکھنے کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ یہی وہ راستی کا راستہ ہے جس پہ گامزن رہ کر ہم کاروانِ ہستی کی بے رحم رواروی سے بچ بچا کر اپنا سفر برقرار رکھ سکتے ہیں۔ چونکہ 'وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں' لہٰذا اس نوع کے ذو جہتی جوکھم اٹھانے کی ناگزیریت پر دلالت کرتے ہوئے نو استعماری حرکیات کے شناور سید مبارک شاہ درست طور پر لکھتے ہیں کہ:

> "اپنے محور پر مسلسل گھومتے ہوئے مرکز کا پیہم طواف کرنا، دو مختلف راستوں پر مسلسل سفر کرنا اور دو الگ الگ گردشوں میں بیک وقت موجود رہنا مدارِ نارسائی میں قائم رہنے کی شرط ہے اور ضمانت بھی"(۱۳)

آج صوبہ پنجاب میں پچاس فی صد لوگ پنجابی ہیں مگر ابتدائی تعلیمی اداروں میں مروج نہ ہونے کی وجہ سے اس زبان کا وقیع ادبی سرمایہ گوشۂ گمنامی میں جا پڑا ہے اور حالت یہ ہو چلی کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے اسے لکھنے پڑھنے سے قاصر ہوئے جاتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی سلوک دیگر مذکورہ زبانوں سے روا رکھا جاتا ہے اور نتیجتاً یہ زبانیں اپنی مزعومہ کم مائیگی کے بموجب ادارہ جاتی سرپرستی سے محروم رہتی ہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ ہمارے بہت سے حکمرانوں اور دیگر مقتدر متعلقین نے اردو کے حق میں متعدد بار احکامات صادر کیے، پالیسیاں بنائیں مگر زبانی جمع خرچ سے آگے بڑھ کر اسے مقتدر ایوانوں میں کبھی عملاً نافذ کرنے کی کوشش سامنے نہیں آئی۔ سپریم کورٹ کے جسٹس جواد ایس خواجہ نے اسے سرکاری سطح پر نافذ کرنے کے لیے تاریخ ساز کردار ادا کیا مگر نتیجہ ڈھاک کے وہی تین پات۔

ایسے میں یہی نکتہ استنباط کے لیے پیش منظر پر ابھرتا ہے کہ اردو زبان کو اس کا جائز آئینی مقام و مرتبہ اسی صورت مل پائے گا جب ہم اپنی قومی یک جہتی کے لیے اس زبان کی ناگزیریت کا مقدمہ سماجی تفاخر اور معاشی افادے سے مزین دلائل و براہین کی روشنی میں ترتیب دیں، اسے عامۃ الناس کے ساتھ ساتھ 'اشرافیہ' کے لیے بھی قابلِ قدر بنائیں اور اس سلسلے میں ایک اجتماعی تحریک برپا کرنے میں کامیاب ٹھہریں۔ یہی وہ مجرب نسخۂ کیمیا ہے کہ جس کی فراہمی سے بالیقین "خوب چمکے گی بہر حال دکنِ اردو"(۱۴)

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

آج پاکستان میں پائی جانے والی لسانی گروہ بندی پہلے سے زیادہ فعال ہوئی ہے جس کی تعصباتی حرکیات انتخابی مہمات میں لسانی بنیاد پر بننے والی شخصی اور جماعتی شناختوں کی صورت بہ آسانی نشان زد کی جاسکتی ہیں۔ ایسے میں اجتماعیت اساس لسانی اَنا کی تعمیر و تشکیل ممکن نہیں رہتی اور نتیجتاً نظریاتی افلاج (Ideological Paralysis) کے خدشات بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسی مجادلاتی فضا میں اردو زبان کو حللِ احمر کی طرز پر پزیرائی دی جائے۔ جو لوگ یا لسانی گروہ اسی زبان کو اپنی امتیازی شناخت کے طور پر متعارف کرواتے ہیں انھیں بطور خاص اس زبان کی تعصباتی انگیخت سے پرہیز کی پالیسی اپنانی چاہیے کہ یہی ان کے، ان کی اس فخریہ زبان کے اور پوری قوم کے مفاد میں ہے۔

قومی یک جہتی کے فروغ میں اردو کی ناگزیریت کا احساس اجاگر کرنے میں شعر او ادبا بہت کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ہماری قوم مسلکی فرقہ واریت، صوبائیت پرستی اور نسلی تفاخر کے ساتھ ساتھ نوع بہ نوع لسانی شناختوں پر ناز کرنے میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ ایسے میں علاقائی زبانیں اردو کو اپنا حریف جانتے ہوئے اس سے محوِ پیکار رہتی ہیں۔ ان حالات میں سخن ور طبقات کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اس قسم کی لسانی محاذ آرائی ختم کروانے میں اپنا قائدانہ کردار ادا کریں۔ اردو کے لیے مصالحت سازی کی ایسی معاصر کاوشیں میر تقی میر (مستند ہے میرا فرمایا ہوا) اور داغ دہلوی (اردو۔۔۔ ہمی جانتے ہیں داغ) وغیرہ کی آمرانہ طرز پر ہونے کے بجائے جمہوری اصولوں کی سیادت میں روبہ عمل آنی چاہیے۔ دوسری زبانوں کے الفاظ کو دودھ میں مکھیاں سمجھ کر نکال پھینکنا، 'گفتگو عوام سے ہے' کا تاثر دے کر عوامی بات چیت سے زبان کی خرابی کا احتمال کرنا اور صرف اپنے فرمائے کو مستند جاننا یا 'اردو ہے جس کا نام' اسے صرف 'ہمیں جانتے ہیں' کی رٹ لگانا فی زمانہ نرگسیت کا روگ پالنے کے مترادف ہو گا۔ اصلاحِ زبان کی ایسی رفت گزشت کاوشیں کاروبارِ شوق کی حسین کڑیاں تھیں مگر آج کاروبارِ شوق کی فرصت کسے ہو کہ جب حسن کو ہیں جان کے لالے پڑے ہوئے۔ آج ہمیں نظریۂ ضرورت کے پیشِ نظر ایک ایسے زباں ساز مکتبۂ فکر و نظر کی تشکیل درکار ہے جس سے اردو اپنی اسمائی ماہیت کو بحال کرتے ہوئے حقیقی معنوں میں عوام کی زبان بن جائے۔ قومی یک جہتی کے لیے اردو کی ناگزیریت کا بیانیہ ہماری ضرورت ہے یا تمنا، سید مبارک شاہ کی نظم "امتیاز" کی سیادت میں اس نازک موضوع پر بھی تجزیاتی بصیرت کے کچھ امکان کھلتے ہیں:

"ضرورت اور تمنا میں بہت سے فرق ہوتے ہیں

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

"ضرورت کی یہی تفہیم کافی ہے

کہ یہ ایسی طلب ہے جو نہ پوری ہو

تو کوئی جی نہیں سکتا

تمنا اختیارِ آدمی کہیے

جسے انسان کی اپنی رضا ایجاد کرتی ہے"(۱۵)

اس شعری بیانیے سے یہی سنہری اصول ہاتھ لگتا ہے کہ اگر قومی یک جہتی کے لیے اردو ناگزیر ہے اور اس نکتے کی متواتر آئینی تسطیر ظاہر کیے دیتی ہے کہ اسے بھرپور عوامی پزیرائی بھی حاصل ہے تو اس زبان کی بتدریج نفاذی حکمتِ عملی کے تحت ابھی سے مرکزی اور صوبائی ملازمتوں کے مقابلہ جاتی امتحانات کے کوئی سے نصف پیپرز اردو میں حل کرنا لازمی قرار دیے جائیں اور اگلے پانچ سال کے بعد مکمل اردو میڈیم کی شرط عائد کر دی جائے جبکہ انٹرویوز کا سارا عمل فی الفور اردو میں مکمل کرنا ضروری قرار دیا جائے تاکہ اس زبان کی تشویق و ترویج تمنا کی حدود سے نکل کر ضرورت کی اقلیم میں داخل ہو اور ایک دیرینہ مسئلہ اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھنے لگے۔ مذکورہ دونوں معاملات میں سعیٔ بسیار کے باوجود اردو کے بجائے انگریزی کا سکہ چلتے رہنا جذبۂ قومیت کی توہین کے مترادف ہے۔ اگر ایسا نہیں ہو پا رہا۔۔۔ جیسا کہ نہیں ہو پا رہا۔۔۔ تو دوسری صورت میں اس مخمصے کی مکدّر فضا کو چھٹانے کے لیے سپریم کورٹ کو سوموٹو ایکشن لے کر اس دیرینہ مسئلے کو حل کروانا چاہیے۔

عملیت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ گریجوایشن کی سطح تک اردو کو لازمی مضمون کے طور پر شاملِ نصاب کرنے کی روایتی ضد ترک کر کے۔۔۔ جس پر عمل بھی نہیں ہو پایا۔۔۔ انٹر کی سطح تک اسے زیادہ تر فنکشنل اسلوب سے ہم آہنگ رکھ کر عمومی اظہار کا ذریعہ بنایا جائے تاکہ اسے مختلف علوم و فنون کی تعلیم و تدریس میں ترجیحی بنیادوں پر برتا جا سکے۔ محمد حسین آزاد کے جیسی مسجع و مقفیٰ نگارشات اردو ادب کے متخصصین کے لیے متعارف کروانا مناسب ہو گا۔

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

ایک اہم بات یہ کہ پاکستان کی جملہ لسانی اکائیوں میں اس زبان کی یکساں پزیرائی اسی صورت ممکن ہے جب ان تمام زبانوں سے الفاظ و محاورات، علاقائی تلمیحات، اقدار و روایات اور دیگر لوازمات کے اخذ و قبول کو اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لیے ترجیحی بنیادوں پر ضروری خیال کیا جائے۔ایسے میں یقیناً بعض اسما، مرکبات اور اصطلاحات وغیرہ اردو کی بنیادی لسانی ساخت سے عدمِ مطابقت کی بنا پر دو علیحدہ اساس کھردرے پن کا موجب بنیں گی مگر یہ تردد کی بات نہیں کیونکہ آہستہ آہستہ اس زبان کا خود کار نظامِ اخذ وارتداد اس کھردراہٹ کو بخوبی اپنے لسانی ساختیے سے ہم آہنگ کرتا جائے گا۔مزید برآں ہر بڑی زبان کی طرح اردو کا ایک مخصوص معیاری لہجہ ضرور ہے مگر مختلف مقامی زبانیں بولنے والے جذبۂ قومیت سے سرشار ہو کر اردو کو ترجیحی ذریعۂ اظہار کے طور پر اسی صورت قبولنے پہ رضامند ہوں گے جب انھیں اپنے مخصوص لہجے کی بنا پر کم نظری سے آنکے جانے کا احتمال نہ رہے۔اگر لفظ 'تابعدار' کو عوام الناس فرمان بردار کے معنوں میں استعمال کیے جاتے ہیں، کوئی 'اکٹھے' کو اگر 'اکھٹے' بولتا ہے، کہیں 'جی ہاں' کے بجائے 'ہاں جی، ہاں جی، ہاں جی' کی تکرار ہوتی ہے، کسی دور دیس کے میکدے میں 'پلا رہا تھا' کہنے کے بجائے 'پلا رہا تھا' کی صدا آتی ہے، مرکبِ اضافی یا عطفی میں مختلف زبانوں کے جوڑ جامے کی اڑچن ہے یا پھر پشتون، سندھی یا بلوچی بھائی تذکیر و تانیث میں کچھ تھوڑی بہت گڑبڑ کیے جاتے ہیں تو اس پہ ہاہاکار کیسی ؟آہستہ آہستہ ایسے فروعی اختلافات زبان کے خود ساختہ مرکزی دھارے کی عمل داری سے عمومی ساخت میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ویسے بھی کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ بغیر کوئی ٹھوس علمی کارنامہ سرانجام دیے، محض اپنے مخصوص لہجے کی بنا پر اردو زبان دانی کے تفاخر پہ اپنی اجارہ داری قائم کر لے۔ایسی کھلی ڈُلی اردوائیت کی فضابندی کے ضمن میں ظفر اقبال کی شاعری ایک ماڈل کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے جو اپنی متنازعہ ترین صورت میں بھی پاکستانی زبانوں کے حسنِ اختلاط کی عمدہ مثال ہے۔

قومی زبان کی بابت ایسی جمہوری ذہن سازی اور اس کی ترجیحی اعتباریت کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ اہم ترین کام یہ ہے کہ حکومتی ایوانوں پر عوامی دباؤ بڑھا کر اس کے عملی نفاذ کو ممکن بنایا جائے۔ہمارے ملک کے جیسی نو مستعمرہ ریاستوں میں مقتدر طبقات اور رعیت میں استعماری پالیسیوں پر ردِّ عمل میں اختلاف کے بموجب باہمی افتراق بہت بڑھ جاتا ہے۔حکومتی کارپردازوں کو عوام الناس سے زیادہ ان شاہ دماغوں کی خوشنودی درکار ہوتی ہے جن کے غیر مرئی اشاروں پر

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

انھیں پتلی تماشے دکھانا پڑتے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ مقتدر ایوانوں کے لیے چناؤ کرتے وقت ایسی سیاسی پارٹی کو ترجیح دی جائے جس کے منشور میں عوامی جذبات کی پاس داری کرتے ہوئے اردو کے لیے لسانی حسّاسیت کے واضح ثبوت موجود ہوں۔

آج کل انفارمیشن ٹیکنالوجی کے بڑھتے ہوئے رجحان کے پیشِ نظر میڈیا اور انفرمیشن لٹریسی (MIL) کی ضرورت بہت بڑھ گئی ہے۔اکیسویں صدی کے حالیہ چند برسوں سے ۔۔۔بالخصوص کووڈ ۱۹ کے دوران اور مابعدی عرصے میں۔۔۔ہمارے ملک کی ایک بڑی آبادی میڈیا صارف میں تبدیل ہو گئی ہے۔ایسے میں ورچوئل دنیا سے باشعور تعامل کرنے اور اس کی فکری گمراہیوں یا نظر فریبوں سے محفوظ رہنے کے لیے اردو نصابات میں ایسے اسباق شامل کرنے کی پالیسی اپنانا چاہیے جس سے میڈیا لٹریسی، انفارمیش لٹریسی اور ڈیجیٹل لٹریسی کا خاطر خواہ انتظام ہو سکے۔ اسی طرح دوسرے سائنسی اور تکنیکی علوم کی تعلیم و تدریس بھی ترجیحی بنیادوں پر اردو میں کی جانی چاہیے۔ ایسے میں متعلقہ مضامین کی بعض اصطلاحات جن کے اردو مترادفات موجود نہیں ،انھیں عربی یا فارسی کے نامانوس الفاظ سے بدلنے کے بجائے جوں کی توں یا حسبِ ضرورت تاریدی عمل سے گزار کر استعمال کی جا سکتی ہیں۔ معاشی افادے کا نظری سرمایہ جس قدر اردو میں بڑھتا جائے گا اسی تناسب سے اس زبان کی بلواسطہ شناسائی اور نوع بہ نوع عصری علوم کی ترجمانی کے لیے اس کی اظہاری صلاحیت میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس طرح دوہری افادیت سے مستفید ہوتے ہوئے ایک طرف تو ہم جدید عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہو پائیں گے اور دوسری طرف قومی زبان سے ایک مثبت نوعیت کی عصبیت (ابنِ خلدون کے نظریاتی تناظر میں) بھی پروان چڑھے گی۔پاکستان جیسے کثیر لسانی مستعمرہ ملک میں جہاں عالم گیریت کا ثقافتی جبر تمام مقامی زبانوں کو معدومیت کے خطرات سے دوچار کیے جاتا ہو ،ایسی لسانی عصبیت بنیادی اہمیت کی حامل ٹھہرتی ہے۔جب تک ہم اردو مخالف عناصر کے اندرونی اور بیرونی گٹھ جوڑ کا مقابلہ کرنے کے لیے عملی سطح کی مزاحمتی حساسیت پیدا نہیں کرتے،اس زبان کا نفاذ اور قومی یک جہتی کے فروغ میں اس کا عمل دخل ممکن نہیں ہو پائے گا۔فی زمانہ مستعمرہ ممالک میں مقتدر قوتوں کا متعارفہ یک لسانی اظہار و ابلاغ اور مروجہ مغربیانہ سماجی ڈھانچہ ایک فخریہ قدر (Snobbery) کے طور پر مقبولیت بنا چکا ہے جہاں معاشی سرگرمیوں پر روز افزوں اجارہ داری سے مذکورہ عالم گیر زبان ٹھیٹ بنیاد پرست اقوام میں بھی دو جذبی کیفیت

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

(Ambivalence)پیدا کر کے انھیں خود سے ہم آہنگ ہونے پہ مجبور کیے جاتی ہے۔ایسے میں کسی مقامی زبان کی بقا اور نشوو ارتقا کو یقینی بنانے کے لیے اس سے جڑی لسانی حساسیت کو تعلیمی منشور کے طور پر ترویج و تشہیر دینا اور بھی ناگزیر ٹھہرتا ہے۔معروف ناقد ڈاکٹر ناصر عباس نیّر نے ہندوستانی نو آبادیات کی نظری شروعات نشان زد کرتے ہوئے نصابی کتب پر خصوصی توجہ دی ہے۔یہاں استعماری آئیڈیالوجی کو فروغ دینے میں کلیدی اہمیت رکھنے والے ان نصابات کی شعریاتی حکمت بیان کرتے ہوئے ایک اہم نکتہ یہ بیان ہوا ہے:

> "نوخیز ذہنوں کے لیے سچائی کی اہمیت جس قدر ہوتی ہے، نصابی کتابوں میں سچ اور جھوٹ کا امتیاز اپنے اثر و عمل کے لحاظ سے اسی قدر 'غیر اہم' ہو جاتا ہے۔ان کتابوں میں ہر بات 'سچ' کا حکم رکھتی اور نئی ذہنی تشکیل میں موثر ہوتی ہے، خواہ وہ کس قدر باطل اور بے بنیاد ہو"(۱۶)

اب ضروری ہے کہ اس آئیڈیالوجی کی ذہن ساز حکمت کو معکوسی جہت میں بھی روبہ عمل لایا جائے مگر یہ تطہیری تعامل 'خذ ما صفا ودَع ما قدر' کے تعمیری اصول پر کیا جانا چاہیے۔اسی تناظر میں اردو زبان کے لیے تشویق و ترغیب اور استعمار یت نواز انگریزی سے متعلق تحفظات و خدشات کو فروغ دینے کے لیے نصابی کاوشیں بھی روبہ عمل لانی چاہئیں۔ایسے خطوط پر لسانی پالیسیاں ترتیب دینے سے نہ صرف مقامی زبانوں کے تحفظ اور احیا کا شعور پروان چڑھے گا بلکہ جبلتِ بقا کی عمل داری میں ایک مشترکہ زبان کو سرکاری طور پر قبول کر کے عالمی جبریت سے مقابلے کی راہ بھی ہموار ہو گی۔

الغرض قومی یک جہتی کے لیے اردو واقعی ناگزیر ہے مگر اس 'گمان کا ممکن' صرف اسی صورت روبہ عمل آ سکتا ہے کہ اسے معاشی افادیت اور سماجی اعتبار کا ذریعہ بنایا جائے۔گر یہ نہیں تو بابا۔۔۔

حوالہ جات

(۱) فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو، قومی یکجہتی اور پاکستان (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۲ء)، ۲۳

(۲) ظہیر احمد صدیقی (مرتب)، کلیاتِ فانیؔ، (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۹۲ء)، ۶۴

(۳) شاہد صدیق: Education Policies in Pakistan، (کراچی: آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۱۶ء)، ۱۴۵

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

(۴) مبارک شاہ، سید، کلیات مبارک شاہ (جہلم: جہلم بک کارنر، ۲۰۱۷ء)، ۴۹۷

(۵) مطالعۂ پاکستان، برائے جماعت دوازدھم، (لاہور: پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ، ۲۰۲۳ء)، ۸

(۶) سر سید احمد خاں، مقالاتِ سر سید، (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء)، ۶۶

(۷) فتح محمد ملک، تحسین و تردید (راولپنڈی: اثبات پبلی کیشنز، ۱۹۸۴ء)، ۲۳

(۸) قائد اعظم کی ریڈیائی تقریر، مشمولہ: Education Policies in Pakistan، ۲۹۴

(۹) سٹینلے والپرٹ: Shameful Flight، (کراچی: آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۶ء)، ۱۸۰

(۱۰) مصطفیٰ زیدی، کلیات مصطفیٰ زیدی، (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء)، ۱۳۴

(۱۱) اظہار الحق، محمد، تلخ نوائی (کالم)، مشمولہ: روزنامہ دنیا، ۹/ اکتوبر ۲۰۲۳ء

(۱۲) نیّر، ناصر عباس، ڈاکٹر، عالمگیریت اور اردو (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء)، ۱۶

(۱۳) مبارک شاہ، سید، کلیات سید مبارک شاہ، (جہلم: بک کارنر، ۲۰۱۷ء)، ۳۶۵

(۱۴) چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ نے اردو میں عدالتی کارروائی کی اجازت دی تو شورش کاشمیری نے ایک نظم "زبانِ اردو کا تشکر نامہ" لکھی تھی، یہ مصرعہ اسی نظم سے لیا گیا ہے۔ (ر۔ک: شورش کاشمیری، کلیاتِ شورش کاشمیری (لاہور: نگارشات، ۱۹۶۲ء)، ۱۶۹۰

(۱۵) مبارک شاہ، کلیات مبارک شاہ، ۲۴۶

(۱۶) نیّر، ناصر عباس، ڈاکٹر، ثقافتی شناخت اور استعماری اجارہ داری (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ۱۰